اداریہ

تحریکات اصلاح اور تجدید واحیائے دین کی صدی

انیس احمد

سنہ دو ہزار عیسوی کے آغاز کا استقبال بڑے اہتمام کے ساتھ مغربی دنیا میں کیا گیا۔ بہت سے جرائد نے اپنے اپنے خصوصی تجزیاتی شمارے نکالے جن میں بیسویں صدی میں علم وفن، سائنس اور ماحولیات کے حوالے سے جائزہ لے کر آئندہ دس سال میں متوقع تبدیلیوں کی طرف نشان دہی کی گئی۔ مسلم دنیا میں بھی شروع ہونے والی صدی عیسوی کی کسی مذہبی اہمیت نہ ہونے کے باوجود اس طرح گفتگو کی گئی جیسے دنیا پتھر کے دور سے اچانک ایٹمی توانائی کے دور میں داخل ہونے والی ہو۔ بلاشبہ ہر آنے والی صدی بلکہ ہر نیا لمحہ اپنے ساتھ نئے مطالبات لاتا ہے اور اہل دانش کو دعوت دیتا ہے کہ وہ خود احتسابی کے عمل کے ساتھ ماضی کا جائزہ اور مستقبل کے اندیشوں اور رجحانات کا تعین کریں۔ نئی صدی عیسوی کے آغاز پر گفتگو کرتے وقت یہ بات آغاز میں ہی واضح ہو جانی چاہیے کہ اسلامی آثار و روایات میں اس کی نہ کوئی اہمیت ہے نہ مقام، ہاں اسرائیلی، اسماعیلی اور بہائی روایات میں ہر صدی یا ہزار سال کے حوالے سے پیشین گوئیاں پائی جاتی ہیں۔

ہماری نگاہ میں تکمیل پانے والی صدی کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ اس میں امت مسلمہ کو مغربی استعمار سے سیاسی حریت کا موقع ملا اور استقلال کے بعد عملاً تمام مسلم ممالک بلکہ خود ان ممالک میں بھی جو کل تک مسلم دنیا کو استحصال کا نشانہ بنائے ہوئے تھے، اسلامی، احیائی اور اصلاحی تحریکات کا قیام عمل میں آیا۔ چنانچہ مصر، شام، فلسطین، عراق، ترکی، برصغیر پاک و ہند، الجزائر، سوڈان، ایران اور انڈونیشیا میں تحریکات اصلاح نے مغربی استعماری نظام کی روایت کو تبدیل کرنے کے لیے مثبت اور تعمیری حکمت عملی وضع کرتے ہوئے اسلامی نظام معیشت و سیاست اور معاشرت و قانون کو نافذ و رائج کرنے کے لیے فکری اور عملی سطح پر اپنی جدوجہد کا آغاز کیا۔ یوں یہ صدی تحریکات اصلاح و تجدید واحیائے دین کی صدی قرار دیے جانے کی

مستحق ہے۔

اس صدی میں خصوصاً برصغیر پاکستان، مصر، ترکی اور سوڈان میں اسلامی نظام حیات کے نفاذ میں نہ صرف تعلیم یافتہ افراد اور اصحاب دانش نے بلکہ عوام الناس نے آگے بڑھ کر حصہ لیا اور گزرنے والی صدی کے نصف تک یہ فکر عالمی سطح پر پھیل گئی۔ ان تحریکات اصلاح نے مغربی سامراج کی سیاسی، معاشی، قانونی اور ثقافتی غلامی کے خلاف علمی اور عملی طور پر جہاد کے ساتھ امت مسلمہ کی فکری قیادت کا بیڑا اٹھایا چنانچہ بیسویں صدی سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ، امام حسن البنا شہیدؒ، عبدالقادر عودہ شہیدؒ، استاذ قطب شہیدؒ، امام خمینیؒ، علی شریعتیؒ، مالک بن نبی استاذ سعید نورسی، ڈاکٹر محمد ناصر جیسے اصحاب علم وفضل کی فکر سے معطر رہی۔ گو بعض علماء نے روایتی فکر خصوصاً تاریخ نگاری میں اہم اضافے کیے اور مسلمانوں کی فکری تاریخ کو تحقیق اور سلیقے کے ساتھ پیش کیا لیکن وہ کوئی عصری اصلاحی اور اجتہادی تحریک برپا نہ کر سکے۔ ایں سعادت بزور بازو نیست--تانہ بخشد خدائے بخشندہ۔

ہماری نگاہ میں تحریکات اصلاح کی سب سے نمایاں خصوصیت دعوت و اصلاح کے میدان میں اجتہاد کے اصول پر عمل درآمد ہے۔ چنانچہ ان تحریکات نے اپنا شعار قرآن وسنت سے براہِ راست استدلال کو بنایا۔ جس طرح امام ابن تیمیہ نے روایتی چار مصادر شریعہ پر غور کرتے وقت صرف اولین دو مآخذ کو بنیاد بنا کر فقہ میں تدوین کا کام کیا تھا بالکل اسی طرح ان تحریکات نے معاشی، سیاسی، معاشرتی اور ثقافتی دائروں میں اجتہاد کو اپنا اصول قرار دیا۔ سیاسی جدوجہد کے پس منظر میں کہیں ان تحریکات نے مروجہ نظام میں رہتے ہوئے نظام کی تبدیلی چاہی اور کہیں معیشت، سیاست، تعلیم اور قانون میں متبادل نظام کے لیے دیگر ذرائع کو استعمال کرنا چاہا۔ پاکستان، سوڈان، الجزائر، اردن اور ترکی اس کی واضح مثالیں ہیں۔ بنیادی طور پر دستوری ذرائع انقلاب کو ماننے کے باوجود تحریکات اصلاح نے بعض صورتوں میں اپنے کارکنوں کو مدافعانہ فنون (Marshall Arts) کی تعلیم اور جسمانی تربیت کے مواقع فراہم کرنے کے ساتھ عملاً جہاد میں حصہ بھی لیا چنانچہ اخوان المسلمون نے سیاسی طور پر انتخابات میں اور عملی طور پر جہاد فلسطین میں سرگرمی سے حصہ لیا جس کی بنا پر مصر کی فوجی حکومت نے انہیں فوج کا ممکنہ حریف سمجھتے ہوئے انتقام کا نشانہ بنایا۔

الجزائر کی جنگ آزادی میں فرانسیسی سامراج کی مخالفت کرتے ہوئے وہاں کی تحریک اسلامی نے بھرپور جدوجہد کی لیکن پاکستان، سوڈان اور ترکی میں تحریکات اسلامی نے قوت کے استعمال سے مکمل طور پر احتراز کرتے ہوئے دستوری ذرائع کو استعمال کیا۔ ان تحریکات اصلاح کا دین وسیاست کو دو الگ بلکہ متضاد دائرے سمجھنے کی روایت سے انحراف ایک اجتہادی عمل تھا اور اسی بنا پر روایتی مذہبی گروہوں اور جماعتوں نے ان تحریکات اصلاح کے سیاسی جھکاؤ کو ''دین کی سیاسی تعبیر'' یا ''تعبیر کی غلطی'' سے منسوب کیا۔ ہمارے خیال میں روایت پرست مذہبی فکر کے علمبرداروں کا ایسا کرنا روایت پرستی کے تناظر میں ایک فطری اور منطقی عمل کہا جاسکتا ہے۔

امت مسلمہ کے سیاسی اور عسکری زوال کے نتیجہ میں جو رجحانات اٹھارہویں صدی اور بیسویں صدی میں سطح پر ابھرے ان میں کم از کم تین قابل ذکر ہیں اولاً یہ تصور کہ زوال کا اصلی سبب فرد کے نفس کا فتنہ ہے اس لیے اگر فرد کا تزکیہ ہو جائے تو معاشرہ خود بخود اصلاح حاصل کر لے گا۔ ثانیاً یہ نظریہ کہ اسلام بحیثیت ایک مذہب، باطل نظام اور اس کے اہل کاروں کے ساتھ تعاون کرنے سے نہیں روکتا اس لیے جب تک کسی خطہ میں مسلمانوں کو ''مذہبی آزادی'' حاصل ہے، نظام حکومت سے ٹکر لینا، اسے تبدیل کرنا یا متبادل نظام پیش کرنا ایک ایسی سیاست ہے جو اسلام کی روح کے منافی ہے۔ ایک تیسرا تصور یہ ابھرا کہ اسلام ایک جامع اخلاقی نظام ہے اور اسلامی اخلاق کا دائرہ کار محض مسکرا کر نرم انداز میں بات کرنے تک محدود نہیں بلکہ معاشی، اخلاقی، معاشرتی عدل اور ذمہ دارانہ اور دیانتدارانہ سیاست اور غیر استحصالی معیشت کے قیام و نفاذ کی کوششوں تک پھیلا ہوا ہے۔ اس لیے نظام کی تبدیلی کے بغیر تنہا ایک فرد بھی اپنے معتقدات، معیشت اور ثقافت پر عمل نہیں کر سکتا۔ یہی رجحان تھا جسے تحریکات اصلاح نے علمی اور عملی طور پر اختیار کیا۔ اس رجحان میں روایتی مذہب اور انفرادی تصور مذہبیت سے بغاوت کے آثار واضح ہونے کی بنا پر روایتی مذہبیت کی نمائندہ جماعتوں اور مشائخ وعلماء نے وہ مصر ہو یا شام، پاکستان ہو یا سوڈان، اس رجحان کی مخالفت کی۔ چنانچہ تبلیغی جماعت کی فکر سے وابستہ افراد نے خصوصاً اور دینی مدارس سے وابستہ افراد نے عموماً اپنی روایت پرستی، تقلید، اپنے مشائخ وعلما کی غیر مشروط پیروی، جسے عموماً سلف کی محبت سے تعبیر کیا گیا، کی بنا پر اصلاحی تحریکات کے اجتہادی مسلک کو سخت ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا اور روایتی

مذہب سے انحراف قرار دیا۔

اصل سبب یہ تھا کہ غالباً روایت پرست طبقات کے نزدیک ان کے علاوہ کسی اور کا اجتہاد کرنا ایک نا قابل قبول جسارت تھا۔ ان کا سرمایہ افتخار، روایت پرستی کی روح کے مطابق اسلاف کے عمل وفکر سے مکمل مطابقت پیدا کرنا تھا جبکہ تحریکات اصلاح، قرآن وسنت کو رہنما اور خلافت راشدہ اور دور صحابہ کو بطور ایک مثال تسلیم کرتے ہوئے اجتہاد کی مدعی تھیں۔

عوام الناس پر ان رجحانات کے عموماً تین ردعمل ہوئے۔ ایک طبقہ نے روایت پرستی کے زیر اثر تحریکات اصلاح کو محض سیاسی نعرہ اور اسے حصولِ اقتدار کی ہوس سے تعبیر کیا۔ دوسرے طبقہ نے دور جدید میں تجدید اور احیائے دین کو مغرب میں مذہب کے انجام کے پیش نظر نا قابل قبول عمل سمجھا لیکن ایک محدود مگر جدید تعلیم یافتہ طبقے اور دینی تعلیم یافتہ افراد کی ایک قلیل تعداد نے تحریکات اصلاح کو اس دور کی ضرورت سمجھتے ہوئے اس میں شمولیت یا اس کی حمایت کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ پاکستان ہی نہیں مصر، شام، سوڈان، ترکی، الجزائر اور دیگر ممالک میں بھی بڑی حد تک ردعمل کی نوعیت یہی رہی۔

تحریکات اصلاح وتجدید کی جانب سے قرآن وسنت کی طرف رجوع کرنے کی دعوت کو مغربی مستشرقین نے ایک بالکل مختلف زاویے سے دیکھا۔ ان کے خیال میں قرآن وسنت کی طرف بلانے کی ہر دعوت رجعت پسندی، ماضی پرستی بلکہ بنیاد پرستی کی دعوت تھی اس لیے تحریکات اجتہاد وجہاد اور اصلاح کو پہلے بنیاد پرستی سے منسوب کیا گیا اور پھر بنیاد پرستی کی تمام منفی صفات کو ان تحریکات کے ساتھ منسلک کر دیا گیا۔ مغربی مستشرقین کے لیے تحریکات اصلاح وجہاد کا سیاسی منہج غیر معمولی پریشانی کا باعث رہا چنانچہ ان تحریکات اصلاح کے حوالے سے یہ بات کہی گئی کہ اگر یہ برسر اقتدار آ جائیں گی تو مغربی جمہوریت کا تقدس خاک میں مل جائے گا۔ حریت نسواں کی تحریک ماضی کی طرف پلٹ جائے گی۔ اسلام کو بطور ایک آلہ واردات کے استعمال کیا جائے گا اور فکری آزادی پر قدغن کے ساتھ دیگر مذاہب کے ماننے والوں کی حریت غلامی اور استحصالی میں تبدیل ہو جائے گی۔ سیکولرازم پر اپنے ایمان بالغیب کے اظہار کے ساتھ مغربی مستشرقین نے اسلام کو سیکولر عقیدہ کا متشدد دشمن بنا کر پیش کیا جس کے نتیجہ میں مغرب کے ایک قاری کے ذہن میں اسلام کی شبیہ ایک تہذیب دشمن اور مغرب کش انتہا پسند مذہب کی بنا دی گئی۔

دوسری جانب جمہوریت اور سیکولرازم سے اپنی تمام تر محبت وعقیدت کے باوجود مغربی سیاست کاروں اور مستشرقین نے مسلم ممالک میں ان تمام فرمانبرداروں کی کھلم کھلا بلکہ بے حیائی کے ساتھ حمایت کی اور ہر ممکن امداد فراہم کی، جو فوجی آمریت یا موروثی بادشاہت کے علمبردار تھے۔ چنانچہ اردن، مراکش، سعودی عرب، ایران اور امارات میں غیر جمہوری موروثی نظام کے ہر علمبردار کی مکمل پشت پناہی کے ساتھ مصر، عراق، شام، ترکی، الجزائر وغیرہ میں فوجی آمروں کو برسر اقتدار لانے اور قائم رکھنے کے لیے ہر حربہ استعمال کیا گیا۔ تاریخ کے ایک غیر جانب دار طالب علم کے لیے یہ دورخا پن اخلاقی اور عقلی طور پر ناقابل تعبیر ہے۔ اسے اس بات پر دکھ ہوتا ہے کہ دوسروں کو جمہوریت کا سبق دینے والوں کو کبھی آئینے میں اپنی صورت دیکھنے کا خیال تک نہ آیا۔ چنانچہ اگر الجزائر میں جمہوریت کی آمد کا امکان ہوا بھی تو امریکی سامراج نے جمہوری قوتوں کو فوج کی آمرانہ قوت کے ذریعے برسوں پیچھے دھکیل دیا۔ اس صدی کے جن دیگر اہم واقعات نے مغرب اور اسلام کے تعلقات پر اثر ڈالا ان میں ایران میں بادشاہت کے خلاف انقلاب اور امریکی سفارت کاروں کا یرغمال بنایا جانا قابل ذکر ہے۔ عالمی طور پر مسلمان اور اسلام کی تصویر کشی میں اس واقعہ کا کردار بڑا اہم رہا۔ انقلاب کے بیس سال بعد نئی صدی کے آغاز میں مغربی مفکرین اور سیاست کار آخر کار مذہبی رواداری رکھنے والے ایرانی قائدین سے تعلقات استوار کرنے پر آمادہ نظر آرہے ہیں۔

اس صدی میں مغرب کی طرف سے تحریکات اصلاح واجتہاد کے معتدل طرز عمل کو ''بنیاد پرستی'' قرار دینے کے باوجود مغربی دنیا میں ان تحریکات اصلاح وتجدید نے مقامی آبادیوں کو غیر معمولی طور پر متاثر کیا اور آج امریکہ ہو یا یورپ ان تحریکات سے متاثر افراد فکری لحاظ سے اپنے آپ کو انہی تحریکات کا جزو سمجھتے ہیں۔ اور بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسلم ممالک میں اسلام کے حقیقی طور پر نفاذ سے قبل خود ان مقامات پر جو کل تک جاہلی تہذیب کے مرکز کہے جاتے تھے، اسلام کی اجتہادی اور اخلاقی فکر شجر طیبہ کی طرح بتدریج ایک ایسے مضبوط اور تن آور فکری شجر کی شکل اختیار کر لے گی جس کی شاخوں کا گھنا اور پرسکون سایہ مغرب کے متشکک ذہن اور روح کو یقین اور اطمینان قلب ونظر سے مالا مال کر دے گا۔ آج امریکہ اور یورپ میں نئی نسل کا اسلام کی عصری تعبیر کی طرف راغب ہونا اور خود سفید فام اور افریقی النسل افراد اور دانشوروں اور عوام کا اسلام کی طرف متوجہ ہونا یہ ظاہر کرتا ہے کہ تحریکاتِ اصلاح واجتہاد کا عمل مسلم ممالک تک محدود نہیں

ہے۔ اسلام کا احیاء اور عروج ماضی میں بھی کبھی کسی خطہ اور قوم کا محتاج نہ تھا۔ شروع ہونے والی صدی میں اجتہادی اور اصلاحی تحریکات کے خود مغرب میں کامیاب ہونے کے امکانات شاید مسلم ممالک سے بھی زیادہ روشن ہیں گو مستقبل کا علم صرف اور صرف اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہی کو ہے۔